

یا میرے عضو یہ میں پیاس کے سمجھ جانے کا احساس پیدا کر دیتا ہے اسی طرح کائنات کا ہر سانحہ چاہے وہ کسی سطح پر رونما ہو رہا ہو خود خدا ہی کے ارادے کا مریون منت ہے۔ گویا تمام معجزات معمول کے عین مطابق اور سراسر فطری ہیں اور تمام فطرت کائنات معجزات پر مشتمل ہے۔ یہ بالخصوص فرقہ اشاعرہ کا نظریہ تھا جنہوں نے قرآنی آیت **إِنَّا اللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِیْرٌ** کی خالص لفظی تعبیر کو قبول کر لیا تھا۔ ان کا عمومی موقف یہ تھا کہ اگر ہم کائنات میں موجود ارادی باغیہ ارادی فعلیتوں کو تسلیم کر لیں تو اس سے خدا کے قادر مطلق ہونے پر حرج اٹھے گا اور اس کی حالت محدود ہو جائے گی۔

اس فلسفہ علت و معلول کے بالکل برعکس نظریہ یہ ہے کہ قوانین فطرت میں ریاضیاتی اور منطقی لزوم کی سی ختمیت موجود ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ اس سے بظاہر مترشح ہوتا ہے کہ اُس کا کوئی فعل قوانین فطرت کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا کیونکہ یہ قوانین اُس کے عملی عہد کی حیثیت رکھتے ہیں معززہ نے اسی نظریے کو اختیار کیا تھا۔ جدید مسلم فکر میں سرسید احمد خاں کو اس نقطہ نظر کا پیش رو خیال کیا جاتا ہے اُن کی رائے یہ ہے کہ خدا جو قوانین بھی چاہے بنا سکتا ہے لیکن ایک دفعہ جب وہ انہیں بنا دیتا ہے تو پھر وہ مستقل طور پر نافذ العمل ہو جاتے ہیں۔ سرسید کی یہ رائے دراصل انیسویں صدی کے پس منظر کو ذہن میں رکھ کر دیکھی جانی چاہیے وہ دور عمومی طور پر مادیت کے عروج اور فطری قوانین کی جبریت پر ایمان و اعتقاد کا دور تھا۔

ان دو نقطہ ہائے نظر کے درمیان عوام الناس کا نظریہ یہ ہے کہ عام حالات میں تو قوانین فطرت موثر رہتے ہیں لیکن جب خدا چاہے ان میں دخل انداز ہو کر کوئی غیر معمولی بات ظہور پذیر کر سکتا ہے جسے مذہب کی زبان میں معجزہ کہتے ہیں اور جو متعلقہ شخص کی عظمت کی دلیل سمجھا جاتا ہے۔ سطور ذیل میں اس عمومی موقف کی فلسفیانہ توجیہ کچھ اس انداز سے کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر سانحہ اور ہر عمل بھی ثابت ہو جاتا ہے اور قوانین فطرت کی ساکھ

نہیں ہے لیکن تمام بڑے بڑے مذاہب ان سے مادرِ می روح اور اس کے درجہ کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ کوئی غیر معمولی واقعہ جو روحانی قوت کے ذریعے کسی پیغمبر یا ولی سے سرزد ہوتا ہے وہ کوئی فوق الفطرت چیز نہیں ہوتی۔ بشرطیکہ ہم لفظ فطرت کو وسیع ترین مفہوم میں ساری کائنات پر محیط سمجھیں۔ ہونا صرف یہ ہے کہ ایک برتر سطح کی علیّت ادنیٰ سطح کے وجود میں تعلیلی نتائج کو بدل دیتی ہے۔ اب اگر ہمارا خدا ایک شخصی خدا ہے جیسا کہ یقیناً ہے اور قرآن کا بھی واضح طور پر یہی موقف ہے تو پھر الوہیت کی سطح پر بھی ایک خاص نوع کی علیّت موجود ہونی چاہیے جو اپنے تمام ماتحت طبقات پر اثر انداز ہو کر ان میں تبدیلی پیدا کر سکے۔ جس طرح حیات تمام افعال و اعمال میں تبدیلی پیدا کر سکتا ہے اسی طرح ایک شخصی خدا میں بھی یہ قدرت اور قوت ہونی چاہیے کہ برتے کو اپنے وسیع تر مقاصد کے مطابق کر سکے۔ یہی معجزہ ہے، اس سے مراد۔ جیسا کہ ابھی کہا جا چکا ہے۔ قوانین فطرت کی خلاف ورزی نہیں ہے۔ ان قوانین کو جنہیں خدا کی عادات یا اُس کی سنت کہہ سکتے ہیں ہرگز توڑا نہیں جاسکتا۔ تاہم ایک نہایت محدود مفہوم میں ایک برتر قانون اپنے سے ادنیٰ قانون کی کارفرمائی میں دخل انداز ضرور ہو سکتا ہے جس کے نتیجے میں کسی خاص مرتبہ وجود کے اندر ایسے افعال رونما ہوتے ہیں جن کی توجیہ اُسی مرتبہ کے لئے مخصوص علل و محولات کی روشنی میں نہیں کی جاسکتی۔

قرآن حکیم میں 'ایمان بالغیب' کی جو ترکیب استعمال ہوئی ہے اسے معجزات کی بحث سے متعلق قرار دیا جاسکتا ہے۔ سورہ بقرہ کی ابتدا میں ان افراد کی خصوصیات گنوائی گئی ہیں جو کتاب اللہ سے ہدایت حاصل کرنے کے اہل ہو سکتے ہیں۔ ان خصوصیات میں 'ایمان بالغیب' کی حیثیت بنیادی معلوم ہوتی ہے۔ بظاہر یہ اصطلاح ایک بغیر سوچے سمجھے اور اندھے اعتقاد (Blind Faith) پر دلالت کرتی ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ قرآن کتاب مبین ہے۔ اس سے استفادہ کرتے کے لئے جو طریق کار بھی تجویز کیا جائے اس میں Mysticism کا مفہوم بھی محال موجود نہیں ہونا چاہیے۔ ایمان دراصل علم و معرفت

بھی قرار دیتی ہے۔

یکسانی اور تعلیل کے قوانین بلاشبہ پوری کائنات میں جاری و ساری ہیں لیکن یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ یہ قوانین وجود کے مختلف مدارج میں مختلف انداز سے کار فرما ہیں۔ جب ایک فطرتی سائنسدان (Natural Scientists) قوانین اور ان کی حکمرانی کی بات کرتا ہے تو اس کے تصور میں بالعموم مشر مادی قوانین ہوتے ہیں۔ وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتا ہے کہ مادہ درجہ وجود میں سے صرف ایک درجہ ہے۔ اس کے علاوہ حیات اور ذہن کے درجہ وجود میں سے بھی ایک درجہ ہے۔ حیات اور ذہن اپنی اپنی تعلیل میں منفرد ہیں۔

زندگی مادے سے اعلیٰ اور ذہن خود زندگی سے برتر ہے جب یہ مختلف طبقات ایک دوسرے سے رابطہ قائم کریں گے تو ہر اعلیٰ علیت ادنیٰ علیت پر اثر انداز ہوگی اور اس میں تغیر پیدا کرے گی۔ اس نقطے کی صراحت علامہ اقبال نے خدا سے مخاطب ہو کر بڑے خوبصورت انداز میں کی ہے۔ علامہ کے اشعار میں۔

تو شبِ فریدی چسراغِ آفریدم سفالِ آفریدی ایلیغِ آفریدم
بیابان و کھار و راغِ آفریدی خیابان و گلزار و باغِ آفریدم
من آمم کہ از سنگ آئینہ سازم من آمم کہ از زہر نوشینہ سازم

یہاں اقبال نے خدا کی قدرت اور اس کی کاریگری سے مقابلہ نہیں کرنا چاہا ہے بلکہ صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ انسان کس طرح اپنے ذہن اور ارادے سے مادی کائنات کے فطری رجحانات کو اپنے تابع بنا سکتا ہے۔ وہ شخص جو محض مادی سطح پر سوچنے کا عادی ہے اُسے اس نوعیت کے مظاہر پر یقیناً احساس ہوگا کہ قوانین فطرت کے خلاف بات ہوگئی ہے۔ وہ اس اختلاف کی تصویر (Justification) کے لئے مادی کائنات ہی کی طرف رجوع کرے گا اور مختلف مفروضات وضع کر کے انہیں ثابت کرنے کی کوشش کرے گا لیکن اُس کی یہ کوشش کبھی مکمل طور پر کامیاب نہیں ہوگی کیونکہ وہ اپنی تحقیق میں کائنات کے اعلیٰ مدارج کو نظر انداز کر رہا ہوگا۔

ایک عام آدمی کو ان تین طبقات کے علاوہ کسی شے کا تجربہ اور مشاہدہ

ہی کی ایک صورت ہے۔ یہ اُس یقین محکم سے عبارت ہے جس کے مطابق مرئی حقائق سے ماوریٰ موثر مذاقیق موجود ہیں اور محسوس اشیاء ہی کلی کائنات نہیں ہیں قرآن نے یقیناً مادی کائنات کی اہمیت اور اس کے بائے میں غور و فکر کرنے پر بہت زور دیا ہے لیکن مختلف مظاہر کو محض آیات الہیہ کا درجہ دیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے فطرت کی اہمیت اس لئے نہیں ہے کہ وہ واقعاً موجود ہے بلکہ اس لئے ہے کہ اس کے اندر کچھ مابعد الطبعی اور تصوراتی جہتیں پائی جاتی ہیں۔ وہ لوگ جو ان جہتوں سے نا آشنا ہیں کائنات کو عملی اعتبار سے خود مکتفی سمجھتے ہیں ان کے نزدیک خدا ایک موثر اور فعال ہستی نہیں ہے جو ہمارا رب و مالک ہے۔ جس سے معجزات کا صدور ہوتا ہے اور جو انسان کے ساتھ ایک صحیح رشتہ استوار کر کے مختلف مقاصد کی تکمیل کے لئے اس کے ساتھ شریک کار ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اگر ان جہتوں کو ملحوظ رکھا جائے تو ہم اس زمان و مکان کی کائنات پر جس قدر زیادہ غور کریں گے معجزات پر ہمارا یقین و ایمان اُسی قدر راسخ ہونا چلا جائے گا۔

(قرآن کا نفرس منعقدہ ۲۹ مارچ ۱۹۸۱ء قرآن اکیڈمی ممبئی پڑھا گیا۔)



بقیہ : ”علم اور رجائیت“

— اس شخص کو جو اس کے دیئے ہوئے علم کو کام میں لاتے ہوئے اور اس کی بخشی ہوئی صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے، غیب پر ایمان لے آتا ہے اور دھی الہی کو اعلیٰ ترین اور صحیح ترین منبع علم جانتا ہے۔ قبولیت دعا کے کسی لمحے پکار اٹھتی ہے:

”یا ایہا النفس المطمئنة ارجعی الی

ربک راضیة مرضیة“



علم اور رجائیت

از فتاح

صلاح الدین الیوبی

ارشاد ربانی ہے: **الابذکر اللہ تطمئن القلوب** یہ بات اپنی جگہ اہم کہ پروردگار
حق تعالیٰ کا یاد رکھنا اور کونسی ہستی ہو سکتی ہے اور ذکر الہی سے بڑھ کر اور کون سا ذکر
ہے۔ لیکن یہ بات اس جملہ کے پہلے جزو سے بھی زیادہ لائق اعتبار اور حامل عمومیت ہے کہ طینان
قلب سے بڑھ کر اور کوئی شے چلبے جانے کے قابل نہیں۔ طمانیت قلب حاصل کرنے کے لئے
ہر نبی آدم اپنے اپنے مبلغ علم کی بنیاد پر نشان لائے منزل تریب دے لیتا ہے اور اسی نسبت سے
ہر ایک کے نزدیک اقدار کا ڈھانچہ بھی جدا گانہ ہوتا ہے۔ یہ اقدار خالص ترین مادیت سے لے کر
اعلیٰ ترین روحانیت تک **Range** کرتی ہیں۔ بایں ہمہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ امید اور جستجو بھلے
خود انسانی زندگی کی اہم ترین اقدار ہیں۔

آرزو جانِ جهان رنگ و بوست

فطرت ہر شے امین آرزو ست

اب سوال یہ ہے کہ ہر شخص اپنے لئے مطلوب کا جو معیار تشکیل دیتا ہے اس کی بنیاد کیا ہوا
کرتی ہے؟ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مطلوب و مقصود کا انتخاب مبلغ علم پر منحصر ہے اور مبلغ علم کا دار و مدار
در حقیقت منبع علم ہے۔ ہر شخص کا یہ انتخاب کہ وہ کون کون سے ذرائع علم کو اپنے لئے اہم اور
قابل عمل جانتا ہے۔ اس کے نظام اقدار پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔

فلاسفہ اور مفکرین نے مختلف ادوار میں مختلف منبع لائے علم کو بنیادی اہمیت کا حامل قرار
دیا۔ اور ان کی متابعت میں چلنے والی اولاد آدم نے اسی رعایت سے اپنے نظام زندگی کو تشکیل دیا۔
چنانچہ Bacon نے نیچر (**Nature**) کو ذریعہ علم سمجھا اور جو اس کی معرفت کو یقینی
سمجھا۔ Descartes نے خدا کو حقیقتِ ثابۃ تسلیم کرتے ہوئے عقل کو علم کا حقیقی منبع قرار